

بحث و نظر

شاہ ولی اللہ کا نظریہ ارتقا قات - ایک مطالعہ

ذاکر عبید اللہ فہد فلاحی

ارتقا قات کے چار مراحل:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۳-۱۷۶۳ء) نے اپنے عمرانی افکار و نظریات کو ”نظریہ ارتقا قات“ میں پوری طرح سمیٹ دیا ہے۔ یہ نظریہ انسانی زندگی اور اس کی سماجی و عمرانی تشکیل کے چار ارتقا قاتی مراحل کی تعبیر و تشریح سے عبارت ہے۔ معاشرہ کی ارتقا قاتی تشکیل پر اس سے پہلے دوسرے حکمائے اسلام بھی گفتگو کر چکے ہیں۔ ابونصر الفارابی (م ۹۵۰ء) جنھیں ”معلم ثانی“ کا خطاب ملا، اپنی تصنیف ”آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ“ میں مثالی ریاست اور مثالی معاشرہ کے تدریجی ارتقا پر مفصل بحث کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ فطرت انسانی کے تقاضوں کی تکمیل اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ بڑی بڑی انسانی جماعتیں اور گروہ یکجا ہو کر ایک دوسرے سے تعاون نہ کریں اور انسانی ضروریات کی تکمیل میں ایک دوسرے کی مدد نہ کریں۔ وہ انسانی معاشرہ کی دو بڑی قسمیں قرار دیتے ہیں کامل اور غیر کامل۔ غیر کامل سے مراد وہ معاشرہ ہے جو کسی خاندان، محلہ، گاؤں کے افراد پر مشتمل ہوتا ہے، جب کہ کامل معاشرہ کی مزید تین قسمیں ہیں: عظیم، متوسط اور محدود۔ ایک سے زیادہ اقوام پر مشتمل عظیم معاشرہ کہلاتا ہے، جب کہ ایک قوم پر مبنی معاشرہ کو متوسط معاشرہ کہا جاتا ہے۔ محدود یا صغریٰ معاشرہ ایک شہر کے باشندوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

’ارتقا قات‘ کا مادہ رفق ہے جس کے معنی نرمی اور کسی چیز سے مدد لینے کے ہیں۔ اس سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مراد وہ نفع بخش تدابیر ہیں جو انسانی زندگی

کے لوازمات میں سے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) کے بقول ارفاق سے شاہ صاحب کی مراد افراد کا ایک دوسرے سے جائز انتفاع، تعاون، اشتراک عمل اور معتدل و متوازن زندگی کے قیام کے لیے تدبیرات نافعہ ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

من عناية الله سبحانه بالإنسان أن
خلق الإنسان مدنى الطبع لا يقيم
ارتغافه إلا بصحة بنى نوعه
واجتماعهم وتعاونهم. ۳

(یہ اللہ نے خصوصی عنایت ہے کہ اس نے
انسان کو خبیثہ مدنیت پسند پیدا کیا جس کا
تعال اور انتفاع اُسی صورت میں ممکن
ہے جب کہ وہ بنی نوع کی رفاقت اختیار
کرے اور ان کے ساتھ گھل مل کر رہے
اور اُن سے تعاون کرے)

شاہ صاحب نے انسانی معاشرہ کے اس تدریجی ارتقا کو چار مرحلوں میں تقسیم کیا ہے۔ ارفاقِ اَوَّل سے اُن کی مراد معاشرہ کی تشکیل کا پہلا درجہ ہے، جس میں انسان نے زبانِ تخلیق کی، زراعت و فلاح کو ذریعہ معاش بنایا۔ رہائش کے لیے مکان اور ستر پوشی کے لیے لباس ایجاد کیے۔ خوراک، مکان، لباس، برتنوں کا استعمال اور بقائے نسل کا اہتمام بنیادی انسانی ضروریات میں شامل ہیں۔ ۵۔ اس مرحلہ میں انتہائی سادہ اور بدوی تہذیب کا رفرما ہوتی ہے اور اس میں مختلف مقامات اور معاشروں میں نسبت زیادہ یکسانیت پائی جاتی ہے، کیوں کہ یہ ارفاق اقوام و قبائل کے لیے زیادہ قابل قبول ہوتا ہے۔ ۶۔

ارفاق دوم میں معاشرہ کے تجربات، اخلاقِ فاضلہ، حسن معاشرت اور رفاہ عامہ کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ارفاقِ اول کو ترقی دی جاتی ہے۔ تدبیر منزل اور مختلف پیشوں کا قیام عمل میں آتا ہے۔ اس مرحلہ میں اُن آداب اور قواعد و ضوابط سے سابقہ پڑتا ہے جو اکل و شرب، نشست و برخاست، سفر و حضر، خلوت و جلوت، لباس و رہائش، صفائی و آرائش، تکلم و مباحثہ، دواؤں کے استعمال، منتر اور جھاڑ پھونک، پیش گوئی کی کام یاب یا نا کام کوشش، خوشی و غمی کی تقریبات اور مواقع وغیرہ سے متعلق

ہیں۔ بے یہ دوسرا مرحلہ ہر شعبہ زندگی کے صحت مند تجربات اور ترقی یافتہ انتفاع و اشتراک پر منحصر ہوتا ہے، جس میں ضرر سے دور اور نفع سے قریب کیفیات و حالات کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ نفع و نقصان کا یہ فیصلہ فرد کے نہیں، بلکہ اجتماعیت کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔ اگر کسی اقدام و عمل میں فرد کا مفاد کا فرما ہو، مگر معاشرہ کو اس سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کا ترک کرنا لازم ہوگا۔ اس ارتفاق میں معاشرہ کے رہنما افراد اور کلنی و اجتماعی رائے اور لطیف مذاق کے حامل افراد کی رہنمائی اہم ہو جاتی ہے اور ان افراد کا اجتماع عام طور پر قصبات اور شہروں میں ہوتا ہے، جہاں انتہائی تدابیر اور طریقے وجود میں آتے ہیں اور ارتفاق و انتفاع کی اعلیٰ و احسن شکلیں دیکھنے و ملتی ہیں۔ ۸۔ شاہ صاحب کے نزدیک اس دوسرے مرحلہ میں پانچ حکمتیں بڑی اہم ہیں: معاشی حکمت، اکتسابی حکمت، حکمتِ منزلیہ، حکمتِ معاملات اور حکمتِ تعاون باہمی۔ معاشی حکمت میں آدابِ اکل و شرب، رہائش و آرائش، جنسی تلمذ اور آفات و امراض وغیرہ شامل ہیں۔ ۹۔ اکتسابی حکمت میں صنعت و حرفت کی مختلف اقسام داخل ہیں۔ منزلی حکمت میں حقوق الزوجین، تعلیم و تربیتِ اولاد، غلاموں کے مسائل اور صحبت و رفاقت کے اصول شامل ہیں۔ معاملات کی حکمت لین دین کے قواعد، خرید و فروخت، بیہ و اجارہ، قرض و رہن کے ضوابط سے بحث کرتی ہے، جب کہ چوتھی حکمت میں کفالت و مضاربیت، شرکت، وکالت اور اجارہ طلبی کے معاملات موضوع بحث بنتے ہیں۔ ۱۰۔

ارتفاقِ سوم انسانی معاشرہ کی ترقی پذیر وہ شکل ہے جس میں ایک ریاست قائم ہو جاتی ہے۔ صنعت و حرفت کے ادارے منظم و مستحکم ہو جاتے ہیں۔ امداد باہمی اور تعاون عروج پر ہوتا ہے۔ کسبِ معاش کے طریقوں کی بہترین تنظیم ہوتی ہے اور تعاون و تکامل کی کارفرمائی کی بنا پر پورا معاشرہ گویا عضوِ واحد بن جاتا ہے۔ اسی طرح کے معاشرہ کو ہم ریاست کہتے ہیں۔ ریاست دراصل شہر، فصیل اور قلعہ کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ تو باہمی رابطہ اور اشتراکِ عمل کی وجہ سے وجود میں آتی ہے، حتیٰ کہ اگر چھوٹی چھوٹی بستیاں ہوں مگر ان میں قربت و یگانگت اور تعاون و تکامل کی روح کا فرما ہو تو ہم اُسے

بھی ریاست کہیں گے۔ اسی ربطِ باہم کی وجہ سے ریاست شئی واحد میں بدل جاتی ہے اور اُس ہستی کا ہر گھرانہ اور ہر گروہ ایک جسم کے عضو کی مانند ہو جاتا ہے۔ ۱۱۔

اس مرحلہ میں ارتفاق و انتفاع بہتر انداز میں اور مطلوب شکل میں اُسی وقت ممکن ہوگا جب کہ سارے افراد ایک عادلانہ قانون کے پابند ہوں اور اُس کی خلاف ورزی کی تاب نہ رکھتے ہوں۔ پابندیِ قانون اور اطاعتِ امر کے لیے ناگزیر ہوگا کہ ایک فرد ایسا ہو جس کی فرماں برداری پر جمہور اربابِ حل و عقد آمادہ ہوں اور جس کے پاس اتنی قوت و شوکت اور اعوان و انصار کی تعداد موجود ہو کہ وہ افرادِ ریاست سے قانون کی پیروی کرا سکے، باغیوں اور مجرموں کی سرکوبی کر سکے اور بزورِ امن و قانون قائم رکھ سکے۔ ۱۲۔ شاہ صاحب اس امر کی صراحت بھی کرتے ہیں کہ ارتفاقِ سوم کا اصل مقصد ریاست کی صحت مند وحدت کی حفاظت اور اس کے منافع کی بدرجہٴ احسن تکمیل ہے، جو امام کے بغیر در حقیقت ممکن نہیں۔ اور امام سے مراد اُن کے نزدیک کوئی انفرادی انسان نہیں بلکہ وہ نظام ہے جو اس طرح کی ریاست میں بتدریج ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ۱۳۔ فاضل معصف نے ان مقاصد کے حصول کے لیے ریاست میں پانچ شعبوں کی تنظیم ناگزیر قرار دی ہے:

۱- صیغہٴ عدلیہ، جو ریاست میں پیدا ہونے والے تنازعات و اختلافات کو قانون کی روشنی میں طے کرے۔

۲- صیغہٴ شہر یا ریت، جو مدنیت و ریاست کو ضرر پہنچانے والے عناصر کا احتساب کرے اور امن و قانون کو ہمیشہ برقرار رکھے۔

۳- صیغہٴ جہاد، جو باغی اور مفسد قوتوں کا خاتمہ کرے۔

۴- صیغہٴ تولیت، جس کے ذمہ تجارتی منڈیوں اور بازاروں کا قیام، قلعوں اور سرحدی چوکیوں کی تعمیر، زراعت و فلاح کا اہتمام اور مظلوم و کم زور طبقات کا تحفظ ہوگا۔

۵- صیغہٴ وعظ و ارشاد، جو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ تبلیغِ دین کا فریضہ انجام دے گا۔

ارتفاقِ چہارم انسانی معاشرہ کے ارتقا کا وہ نقطہٴ کمال ہے جہاں ارتفاقِ سوم

کے مرحلہ میں قائم ہونے والی مختلف وحدتوں اور سیاسی و عمرانی اکائیوں کے باہم اتحاد قائم کرنے کے لیے حاکم اعلیٰ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جب مختلف ریاستیں ارتفاق و اشفاق کے لیے مصروف کار ہوں گی تو اُن کے درمیان مفادات کا تناؤ اور فکرو عمل کی کشاکش ہوگی جو بہم جدال و قتال تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ اس صورت میں انہیں وحدت و سالمیت کی لڑی میں پروئے رکھنے کے لیے اور تمدنی و عمرانی لوازم کی تکمیل کے تحفظ کے لیے ایک مقتدر اعلیٰ کا وجود ناگزیر ہوگا جو خلافتِ عظمیٰ کو اس کے تمام تقاضوں سمیت قائم کر سکے۔ اسی ادارہ کو ہم مذہب کی اصطلاح میں ”خلیفہ“ کہتے ہیں۔ ۱۵۔ بلکہ ایک دوسرے مقام پر شاہ صاحب اسے ’خلیفۃ الخلفاء‘ کا نام دیتے ہیں جو اتنا صاحبِ سطوت، باجبروت، پر شکوہ اور صاحبِ اقتدار ہو کہ بزورِ شمشیر ایسے اقتدار سے محروم کرنا کسی دوسرے فرد یا گروہ کے لیے ناممکن ہو۔ ۱۶۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نظریہ ارتقا قات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خمیر میں دو بنیادی اصول کار فرما ہیں: ایک اصول ہے فطرتِ انسانی سے اس کی ہم آہنگی، اور دوسرا اصول ہے اس کا الہامی ہونا۔ وہ صراحت کرتے ہیں کہ انسانی معاشرہ کے مرحلہ وار ارتقا کا یہ عمل فطری ہے یعنی تمام اقوام و قبائل اور مذاہب و ادیان کے حاملین میں یہی فطری ارتقا رونما ہوگا۔ ترقی کی رفتار میں کمی بیشی ہو سکتی ہے، مگر ترتیب یہی ہوگی، کیوں کہ اس کے علاوہ کوئی اور ترتیب ممکن ہی نہیں ہے۔ ہاں اس کا امکان ہے کہ اصولی باتوں میں اتفاق ہونے کے بعد تفصیلات میں اختلاف اور جزوی اور ثانوی مسائل میں ایک دوسرے سے فرق ہو، مثال کے طور پر ارتفاقِ اوّل کے مرحلہ میں مبادی و کلیات پر اتفاق عام ہونے کے باوجود یہ عین ممکن ہے کہ علومِ طبیعیہ سے لگاؤ رکھنے والا طب کے محامن پر توجہ دے، نجومی ستاروں کے خواص پر گیان دھیان کرے اور روحانیت کی طرف مائل فرد احسان کے مقامات پر مرکوز ہو جائے، کیوں کہ ہر قوم کے اپنے کچھ آداب و رسوم اور روایات ہوتی ہیں جو اُن کی شناخت بن جاتی ہیں اور اس سے مزاجوں میں کسی قدر تنوع پیدا ہو جاتا ہے، مگر اصولی اور بنیادی باتوں میں وہ سب یکساں طور پر متفق ہوتی ہیں۔ ۱۷۔

ارتفاق کے اس ارتقائی عمل کو شاہ صاحب الہامی قرار دیتے ہیں، یعنی ان تمام مراحل میں انتفاع کا یہ جذبہ اور خواہش جبلی و فطری اور خدا کی ودیعت کردہ ہے، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ کسی دور دراز صحرا یا جنگل میں اگر کوئی آدمی پیدا ہو اور وہاں اس نے دوسرے انسانوں کو ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے نہیں دیکھ تب بھی وہ انہی اصولی و مراحل ارتفاقات کے تحت زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوگا اور تمدنی زندگی کے جملہ لوازم رفتہ رفتہ اس کی راہ متعین کرتے چلے جائیں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ارتفاق کا یہ عمل موروثی نہیں، بلکہ الہامی ہے۔ ۱۸۔

ارتفاق کی فطری و انسانی ترجمانی:

شاہ صاحب کا یہ نظریہ ارتفاقات مذہب اور وحی الہی کے کسی حوالہ کے بغیر تشکیل پاتا اور ارتقا کے تمام مراحل طے کرتا نظر آتا ہے، اس لیے کہ اس کی تعبیر و تشریح میں فاضل مصنف قرآن کا حوالہ دیتے ہیں نہ احادیث نبویہ کا۔ اس نظریہ کی بنیاد وہ مذہب پر رکھتے ہی نہیں بلکہ فطرت اور انسانیت کو اصل عامل اور محرک مان کر اس کی ایسی ترجمانی کرتے ہیں جو تمام مذاہب کے علم برداروں کے لیے قابل قبول ہو۔ البتہ اس ترجمانی و تشریح میں خدا کی کار فرما قوت کو محرک اولین قرار دے کر لامذہبیت اور خدا بیزاری سے بھرپور اجتناب کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر تاویل لأحادیث میں ایک مقام پر کہتے ہیں:

(اللہ نے ہر انسان کو ذہانت سے نوازا ہے جس سے وہ ان تمام ارتفاقات سے واقف ہو جاتا ہے جن کا تعلق آداب معیشت، تدبیر منزل، تنظیم معاملات، ریاست کے سیاسی مسائل اور امت کی سیاسی پالیسیوں سے ہے۔ چنانچہ وہ اُن مضامین و مفادات سے آشنا ہو جاتا ہے جن کا رشتہ قوم سے ہوتا ہے)

ومنها أن رزقه الله فطنة يعرف بها الارتفاقات من آداب المعيشة وتدبير المنزل والمعاملات وسياسة المدينة وسياسة الأمة فعرف المصالح التي يجري القوم فيها. ۱۹۔

یہ شاہ صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ وہ مذہب میں نہیں، پورے نظام انسانی میں الہام کی کارفرمائی کی ترجمانی کرتے ہیں، مگر اس کی ایسی دل نشیں عقلی تشریح کرتے ہیں کہ عمرانیات کا مابعد الطبیعیات سے تعلق قائم رکھتے ہوئے اور انسان اور خالق کے درمیان دائمی رشتہ برقرار رکھتے ہوئے اُس پر مذہب کے بجائے فطرت و جبلت کی گہری چھاپ ڈالنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

اس نکتہ سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا یہ نظریہ ارتقا فاق قرآن کریم کی تعلیمات سے میل نہیں کھاتا، یا انھوں نے اسلام سے ہٹ کر دوسرے افکار و تصورات کی ترجمانی کی ہے۔ اُن کی دوسری تحریریں اس حقیقت کا برملا اعلان و اعتراف کرتی ہیں کہ دین اسلام انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور وہ تمام عقلی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ وہ اس نظریہ کے ذریعہ غیر محسوس طریقے سے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ دین اسلام ہی عمرانی تقاضوں کے مطابق ہے۔ اُن کے دور میں ہر چیز کو عقل کی میزان میں پرکھنے کا جو خطرناک فتنہ چنپ رہا تھا اُس پر تنقید کرتے ہوئے خود کہتے ہیں:

اِہل بدعت نے بہت سے اسلامی مسائل	اِنْ الْمبتدعین شَغَوْا فِی کثیر
میں تشکیک پیدا کر دی ہے کہ وہ عقل	مِن الْمسائل الْإِسْلَامِیَةِ بِأَنھَا
کے خلاف ہیں اور ہر خلاف عقل بات	مُخَالَفَةٌ لِلْعَقْلِ وَکُلِّ مَاھُو مُخَالَفٌ
کی تردید یا اس کی تاویل ضروری ہے	لَهُ یَجِبُ رَدُّہٗ أَوْ تَاوِیْلُہٗ۔ ۲۰

شاہ صاحب اس تشکیک اور فتنہ پروری کے استیصال کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ احکام شریعت کے مصالح کو کھول کھول کر بیان کیا جائے اور اس کے اصول و قواعد اسی طرح وضع کیے جائیں جس طرح حکمائے اسلام نے یہود و نصاریٰ اور دہریوں وغیرہ کے مناظروں اور مذہبی جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے کیا تھا۔ ۲۱

معجزات نبوی سے استدلال:

وہ دین اسلام کو فطرت کی عین پکار اور انسان کی عمرانی ضروریات اور سماجی و

تہذیبی تقاضوں کی تکمیل کا واحد ذریعہ ثابت کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ کے دو بڑے معجزات پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ یہ دونوں معجزے عقلی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے، ایک قرآن کریم اور دوسرا شریعت مطہرہ۔ وہ قرآن کریم کے اس معجزانہ پہلو پر زور دیتے ہیں کہ اس کی تعلیمات حیرت انگیز اور تاقیامت بدلتے ہوئے حالات میں منارۃ نور ہیں:

وازاں جملہ وجہ ست کہ جز متدیرین
در اسرار شرائع را فہم آں میسر نیست
وآن آنست کہ ایم علوم خمسہ نفس ایضا
دلیل بودن قرآن نازل من اللہ بجبت
ہدایت بنی آدم است۔ ۲۲

معجزہ کا ایک پہلو اور ہے اور اسے اسرار شریعت پر غور و فکر کرنے والوں کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ قرآن کریم کے علوم پنج گانہ خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے اور بنی آدم کی ہدایت کے لیے وحی ہوئی ہے۔

آگے فرماتے ہیں:

ہم چنیں چوں عالم اسرار شرائع می داند
کہ در تہذیب نفوس کدام چیز با افراد
انسان سے تو اں القانمود، بعد ازاں در
فنون خمسہ تامل می کند بے شک درمی یافد
بد کہ ایں فنون در معانی خود بوجہ واقع
اند کہ ازاں بہتر صورت نہ بندد۔ ۲۳

اسی طرح اسرار شریعت کا ماہر چوں کہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ تہذیب نفس اور اصلاح تعلیم و تفہیم ضروری ہے، اس لیے جب وہ قرآن کے فنون خمسہ پر تدبر کرتا ہے تو اسے اس حقیقت کو ماننے میں کوئی تامل نہیں رہتا کہ یہ علوم و فنون خمسہ جس انداز میں پیش کیے گئے ہیں اُس سے بہتر صورت ممکن نہ تھی

اس لیے علامہ شبلی نعمانیؒ (۱۸۵۷-۱۹۱۳ء) اس قرآنی خدمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”قرآن مجید کے متعلق سب سے بڑا نکتہ، جو تمام قداماء سے رہ گیا تھا

اور جس کوشہ صاحب نے ظاہر کیا، یہ تھا کہ تمام لوگ قرآن مجید کو صرف فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ سمجھتے آئے تھے۔ یہ کسی کو خیال نہ آیا کہ قرآن مجید کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ اخلاق، تزکیہ نفس، توحید، رسالت اور معاد کے جو حقائق قرآن میں مذکور ہیں طاقت بشری کی دسترس سے باہر ہیں۔“ ۲۴

نبی کریم ﷺ کا دوسرا بڑا معجزہ شریعتِ مطہرہ ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ فطری تقاضوں کی بدرجہ اتم تکمیل کرتی اور انسانوں کے تمام طباقوں کے مفادات کی رعایت و حفاظت کرتی ہے۔ اس حقیقت کا اثبات شاہ صاحب نے عقلی انداز میں کیا ہے اور یہی ان کا نمایاں کمال ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ امت کے اربابِ علم و تفقہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ شریعت کے اعجاز کو واضح کریں، اس کی حکمتوں اور مصالح کی تشریح کریں اور یہ بتائیں کہ اقوامِ عالم کی فلاح و سعادت اور ان کے مفادات و مصالح اسی شریعت کی مخلصانہ پیروی میں مضمر ہیں:

فلما انقضیٰ عصرهم وجب ان
یکون فی الامة من یوضح وجوه
هذا النوع من الإعجاز والآثار
الدالة علی ان شریعته ﷺ اکمل
الشرائع وان إتيان مثله بمثلها
معجزة عظیمہ کثیرہ مشہورہ
لا حاجة الی ذکرها. ۲۵

جب اسلاف کا دور گزر گیا تو امت میں
ایسے افراد کا اٹھنا ضروری ہو گیا جو معجزہ
کی اس نوعیت کے پہلوؤں کو واضح
کریں اور ان آثار کو مبرہن کریں جن
سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی
شریعت سب سے مکمل شریعت ہے اور
اس شریعت کا نزول بہت بڑا اور بہت
مشہور معجزہ ہے۔

فاضل مصنف یہ ثابت کرتے ہیں کہ انبیاء کرام کی آمد کا ایک مقصد ارتقا قات کی اصلاح و تہذیب ہے اور اس طرح بعثتِ انبیاء اور عمرانی ارتقا میں ایک مضبوط تعلق اور گہرا نظم پیدا ہو جاتا ہے:

انبیائے کرام کی بعثت کا ایک مقصد اپنی قوم میں رائج ارتقاقت کی صورتوں کی اصلاح کرنا ہے۔ وہ عام طور پر معروف و مانوس سے متصادم طریقے اختیار نہیں کرتے، الا یہ کہ ناگزیر ہو۔ اور یہ کہ مصالح و مفادات کی سوچ میں زمانہ اور عادات و رسوم کے بدلنے سے فرق ہو جاتا ہے اسی لیے نسخ احکام درست ہے۔

وإن مراد الأنبياء عليهم السلام
اصلاح ماعندهم من الارتقاقت
فلا يعدل عنها إلى ما بين
المألوف إلا ما شاء الله وإن سطان
المصالح تختلف باختلاف
الأعصار والعادات ولذلك صح
وقوع النسخ. ۲۶

شریعت محمدی کے مقاصد:

اپنی تصنیف البدور البزغة میں شاہ صاحب نے شریعت محمدی کے جو چار مقاصد بیان کیے ہیں اُن سے بھی بعثت نبوی اور نظام ارتقاقت میں گہری ہم رنگی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بنی نوع انسان میں رائج نظام ارتقاقت سے سب سے زیادہ مطابقت اور ہم آہنگی شریعت محمدی رکھتی ہے، کیوں کہ اس شریعت کا مقصد اول ارتفاق ثانی کی اصلاح کرنا ہے، کیوں کہ اقوامِ عالم میں اور خاص طور سے اقوامِ عرب میں یہی ارتفاق رائج تھا اور اس میں بہت سی خرابیاں داخل ہو گئی تھیں جن کی درستی آپؐ کے پیش نظر تھی۔ اللہ کے رسول نے اس ارتفاق کو درست کیا اور اس کی کچی دور کی۔ اس عمل میں آپؐ نے انسانی خصوصیات اور تجربی علوم کو بنیاد بنایا اور خدا کی تعظیم کا رنگ اس پر غالب رکھا۔

شریعت محمدی کا مقصد دوم معاشرتی رسوم کی اصلاح ہے، تاکہ توجہ و انابت الہی سے انھیں ہم آہنگ بنا دیا جائے اور ربانی طریقہ سے کوئی تصادم نہ رہے، عوام کے لیے وہ نفع آور ہوں اور اُن میں وسعت اور کشادگی ہو۔ لوگ اُن سے تنگی اور ضرر محسوس نہ کریں۔

مقصدِ ثالث ارتفاق سوم کا قیام و استحکام ہے، تاکہ ہر مظلوم کی اشک شوقی ہو،

فتنہ و فساد سے بندگانِ خدا کو محفوظ رکھا جائے، لوگوں کے تنازعات عدل کے ساتھ حل ہوں اور ظالموں اور مفسدوں کی سرکوبی ہو جائے۔ ۲۷

شریعتِ محمدی کا چوتھا مقصد ارتفاقِ رابع کے تحت دینِ اسلام کا غلبہ اور دوسرے ادیان و مذاہب پر اس کا استیلاء ہے۔ یہ غلبہ اس حد تک مکمل ہو کہ روئے زمین پر کوئی اس کی مزاحمت کرنے والا موجود نہ رہے۔ ۲۸

دینِ اسلام کے غلبہ کا ایک راستہ، شاہ صاحب کے نزدیک مخالفین سے جہاد ہے۔ ۲۹ غلبہٴ دین کا دوسرا راستہ دلیل و برہان کا ہے، تاکہ عقل و دماغ کو مطمئن کیا جائے اور لوگوں کو اسلام کی صداقت و حقانیت پر شرحِ صدر ہو سکے۔ شاہ صاحب اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

واجب ہے کہ صحیح عقائد کو دلیل و برہان کے ذریعہ یا نفع بخش خطابی اسلوب میں ثابت کیا جائے۔ عوام کے ذہنوں میں یہ حقیقت راسخ کی جائے کہ دوسرے مذاہب قابلِ اتباع نہیں ہیں، کیوں کہ وہ کسی معصوم شخصیت سے منقول نہیں ہیں یا قوانینِ ملت پر ان کا انطباق نہیں ہوتا اور یہ کہ ان میں تحریف ہو گئی ہے، ایک شی کو اس کے نامناسب محل میں رکھ دیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کی تصحیح علانیہ ہو اور دین کی ترجیحات واضح کی جائیں کہ یہ آسان ہے اس میں بڑی وسعت ہے۔ اس کی حدود واضح ہیں جن کے حسن کو عقل و دماغ کی روشنی میں دیکھ اور پرکھ سکتی ہے اور اس کے قوانینِ عوام کے لیے بڑے مفید ہیں۔

و جب أن یثبت بأمرور برهانية أو خطابية نافعة فی أذهان الجمهور أن تلك الأديان لا ينبغي أن تتبع لأنها غير مأثورة عن المعصوم أو أنها غير منطبقة على قوانين الملة أو أن فيها تحريفاً ووضعاً للشئ فی غير موضعہ ویصح ذلك علی رؤس الأشهاد ویبین مرجحات الدین القویم من أنه سهل سمح وأن حدوده واضحة یعرف العقل حسنہا وأن لیلها نهارها وأن سننها أنفع للجمهور. ۳۰

ارتفاق اور تقرب الہی:

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نظام ارتفاقات کی طرح تقرب الہی کے جذبہ کو بھی فطری اور الہامی مانتے ہیں۔ چنانچہ المبدور البازغہ میں فرماتے ہیں کہ ”ارتفاقات کا نظام اور بطور خاص ارتفاق دوم و سوم پر نظام انسانی کی بنیاد استوار ہے اور یہ محض عنایتِ خداوندی کے طفیل میں نوع انسانی کو عطا ہوا ہے۔ اسی طرح تقرب الہی کے جذبات بھی انسانی طبعیتوں میں ودیعت کردہ ہیں، خاص طور سے عبادت گزاری، احسان اور برائیوں سے بچنے کا داعیہ ہر فرد بشر میں فطری طور سے موجود ہے۔“ ۳۱

ارتفاق اور تقرب کے حسین امتزاج سے صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ شاہ صاحب تقرب سے بے نیاز ہو کر ارتفاق کے پرورش پانے والے عمل کو حیوانیت قرار دیتے ہیں اور ارتفاق سے کٹ کر تقرب کی زندگی بسر کرنے کو رہبانیت سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پوری انسانیت ارتفاق و تقرب کے اصولی مسائل میں متفق ہے۔ اگر اختلاف ہے تو اُن کے حصول کے طریقوں میں ہے۔ اس سے وہ نظام تشکیل پاتا ہے جسے فاضل مصنف ’ملت‘ کا نام دیتے ہیں۔ جب معاشرہ کسی ملت میں ڈھل جاتا ہے تو ارتفاق و تقرب کا بیک وقت حصول آسان ہو جاتا ہے۔ تشکیل امت کا یہ جذبہ بھی انسانوں کے اندر ودیعت کردہ ہے:

وَأَمَّا الذَّاعِيَةُ الْمُوَدَّعَةُ فِي أَصْلِ
طَبَائِعِهِمْ فَهِيَ انْقِيَادُهُمْ لِأَصُولِ
الْارْتِفَاقَاتِ وَالْاقْتِرَابَاتِ مِنْ قَبْلِ
فَطَرْتَهُمْ. ۳۲

ان کی طبعیتوں اور مزاجوں میں پوری
طرح یہ بات راسخ کر دی گئی ہے کہ وہ
اپنی فطرت کے دباؤ میں ارتفاق اور تقرب
کے بنیادی اصولوں کی پیروی کریں۔

ارتفاق اور تقرب کے بہترین تعامل کے لیے ضروری ہے کہ کردار سازی ہو، اُن کی اصلاح اور تزکیہ ہو اور معاشرہ کے ہر فرد کی اخلاقی نشوونما ہو، تاکہ ایک صالح تہذیب وجود میں آئے۔ کردار سازی کے عمل میں شاہ صاحب چار بنیادی اخلاقی

صفات کو اساس مانتے ہیں، طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت۔ ان صفاتِ اربعہ کو تہذیبِ نفس اور اصلاح کے عمل میں کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ تمام انبیاء ان ہی کی تعلیم و تربیت کے لیے بھیجے گئے اور تمام شریعتوں میں ان ہی پر زور رہا۔ ۳۳

طہارت سے بدن کی صفائی کے ساتھ فکر کی طہارت بھی مراد ہے۔ شاہ صاحب اسے غسل و وضو کے اندر محصور نہیں مانتے، بلکہ ان کی روح اور ان کے مقصد پر بھی زور دیتے ہیں: ”اور اس سے مراد وہ سرور و انبساط اور فرحت و بشارت ہے جو وضو و غسل کے بعد پیدا ہوتی ہے۔“ ۳۴

اخبات سے مراد عاجزی و فروتنی، خشوع و خضوع، انکسار و افتادگی کی وہ کیفیت ہے جو خدا کی بارہ گاہ میں سر تسلیم خم کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان جب خدا کے جمال و جلال کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس پر حیرت و دہشت طاری ہوتی ہے اور پھر تذلل اور نیاز مندی کی کیفیت اسے گھیر لیتی ہے۔ ۳۵

سماحت سے مراد ضبطِ نفس کا وہ مرحلہ ہے جس میں انسان قوتِ بہیمیہ کے جذبات و محرکات کے سامنے سیر انداز نہیں ہوتا اور اس کے نقصانات اور فتنوں سے محفوظ رہتا ہے۔ ۳۶ سماحت کے لغوی معنی کشادہ دلی، فیاضی اور دریادلی کے ہیں۔ یہ صفت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ نفس کے حیوانی تقاضوں پر آدمی کو قابو حاصل ہو اور وہ ملکوتی صفات کی طرف پیش قدمی کرتا رہے۔

عدالت سے مراد وہ نفسی قوت اور ملکہ ہے جس سے ایسی سرگرمیاں اور اقدامات جنم لیتے ہیں جن سے نظامِ تمدن کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔ ۳۷

ان صفاتِ اربعہ کے اثرات انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ طہارت کے نتیجے میں فکری تطہیر ہوتی ہے اور اس سے ملنے والی فرحت و لذت، سرور و انبساط سے معاشرہ بھی مستفید ہوتا ہے۔ اخبات سے جو انفرادی عاجزی و فروتنی نمودار ہوتی ہے اُس کے لطف سے معاشرہ میں اخوت و مساوات، احترامِ انسانیت کو فروغ ملتا ہے۔ سماحت کے نتیجے میں معاشرہ خود غرض و ناپرستی، حرص و بخل، انتقام و کینہ پروری سے محفوظ رہتا

ہے اور صبر و تحمل، عفو و کشادہ دلی، رواداری و تکریم انسانیت، ایثار و قناعت کے اوصاف کا معاشرہ میں چلن ہوتا ہے اور صفت عدالت کا مظاہرہ تو معاشرہ ہی میں ہوتا ہے۔

شاہ صاحب افراد کو اُن اخلاق عالیہ سے سرفراز کرتے ہیں جن سے صالح عمران اور نفع آور تمدن وجود میں آئے، تو دوسری طرف وہ ایسی اجتماعی معاشیات کو فروغ دیتے ہیں جن سے انفرادی سیرت سازی کو تقویت ملے۔ اگر معاشرہ اجتماعی اخلاقیات کو تشکیل نہیں دیتا تو انفرادی اخلاق کو بھی فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر نظام ارتقاات کی تشکیل اس انداز سے ہو کہ عوام الناس کو ہر وقت فکرِ معاش دامن گیر ہو اور دن رات کے چوبیس گھنٹے نان شبینہ کے حصول میں ہی صرف ہو جائیں، انھیں اولاد کی تعلیم و تربیت کے وسائل میسر نہ ہوں، رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اُن کا ذہن سوچ نہ سکے اور احباب و رفقہ کی دل داری کے لیے انھیں موقع نہ ملے تو عبادت اور تزکیہ نفس کے لیے انھیں کیسویٰ کیسے مل سکتی ہے؟

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسی لیے زندگی گزارنے کے تین طریقے بیان کیے ہیں اور اُس طریقہ زندگی کو مطلوب قرار دیا ہے جو پیش نظر مقصود کے حصول میں مدد و معاون ہو:

۱۔ رفاہیت بالغہ، یعنی بے انتہا آسائش اور ہر قسم کے عیش و طرب سے مالا مال زندگی۔

۲۔ رفاہیت متوسطہ، معتدل طرزِ زندگی، جس میں امیر اور غریب کے درمیان زیادہ خلیج نہ ہو۔

۳۔ رفاہیت ناقصہ، گھنیا طرزِ زندگی۔

فاضل مصنف نے پہلی اور تیسری قسم کو نامطلوب قرار دیا ہے۔ پہلا طرزِ حیات مسرفانہ اور عیاشی کو دعوت دینے والا ہے، جب کہ تیسرا طرزِ زندگی انتہائی ناقص، گھنیا اور چوپایوں کی زندگی کی مانند ہے۔ اس میں انسان اتنا در ماندہ اور مفلوک الحال ہوتا ہے کہ جانوروں سے قریب ہو جاتا ہے۔ ۳۸ قرآن ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرنے پر زور دیتا ہے اور انبیائے کرام معتدل طرزِ حیات

ہی کو پسند کرتے ہیں:

”انبیائے کرام نے معتدل ارتفاق ہی کو اختیار کرنے کا حکم دیا کہ عجی بادشاہوں کی طرح انسان عیش کوٹی ہی میں نہ ڈوبا رہے اور نہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے والے قبائل کی وحشیانہ زندگی گزارنے کی سطح پر اتر آئے“ ۳۹

منہاجیات قرآن کا انطباق:

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے نظریہ ارتقا قات کی عمارت جن بنیادوں پر استوار کی ہے وہ قرآن ہی سے ماخوذ و مستنبط ہیں۔ درمیان بحث قرآن کریم کے حوالے نہیں ہیں، کیوں کہ وہ اسے عالمی اور انسانی نظریہ بنا کر اقوام عالم کے لیے قابل قبول بنانا چاہتے ہیں، مگر قدم قدم پر قرآن کریم کی روح بولتی محسوس ہوتی ہے۔ ہر فکر، اصول، طریقہ اور منہاجیات میں قرآنی آیات کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔

بین المذاہب مکالمہ کے لیے مشترک امور و مسائل سے آغاز کرنا قرآن کریم ہی کی تعلیم ہے۔ اہل کتاب کے تعلق سے ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ
سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ
وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا (آل عمران: ۶۴)

کہہ دو اے اہل کتاب اُس چیز کی
طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے
درمیان مشترک ہے، یہ کہ ہم اللہ کے
سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس
کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں۔

دعوتِ دین کا یہ حکیمانہ طریقہ قرآن کا عطا کردہ ہے کہ اگر مخاطب سے گفتگو کے لیے کوئی مشترک بنیاد مل سکتی ہو تو اُسی پر بحث اور مکالمہ کو آگے بڑھایا جائے۔ اور خواہ مخواہ اپنی انفرادیت پر اصرار نہ کیا جائے۔ اہل کتاب آسمانی کتابوں کے حامل ہونے کی وجہ سے توحید کی تعلیم سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کی علم برداری کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔ انھوں نے شرک کی راہ اپنے نبیوں اور صحیفوں کی تعلیمات میں تحریف کر کے اختیار کی تھی۔ اسی لیے قرآن نے اسی نقطہ سے گفتگو شروع کی اور پھر دھیرے

دھیرے اس کے تقاضے اور لوازم واضح کیے۔

اس دعوتی منہاج کا استعمال شاہ صاحب کے نظریۂ ارتقاات میں پوری طرح نمایاں ہے۔

فاضل مصنف کا یہ استدلال کہ ارتفاق کا نظام فطری اور جبلی ہے، قرآن کریم سے، خود ہے۔ عمرانی و تہذیبی ارتقا کو فطرت کی پکار سے تعبیر کرنا قرآن کی درج ذیل آیت کی عملی تفسیر ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا
فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا
لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ
الْقَیْمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ
(الرود: ۳۰)

پس تم اپنا رخ یکسو ہو کر دین کی طرف
کرو۔ اُس دین فطرت کی پیروی کرو
جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی
بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں
ہے۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر
لوگ نہیں جانتے۔

یہاں قرآن نے دین اسلام کو دین فطرت کے طور پر پیش کیا ہے اور اس کی صراحت کی ہے کہ یہ دین کوئی خارج سے تھوپی ہوئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ عین تمہاری فطرت کا ظہور اور تمہارے اپنے باطن کی دولت ہے جو تمہارے دامن میں ڈال دی گئی ہے۔ اس قرآنی بیان سے یہ حقیقت الم نشرح ہوتی ہے کہ یہ نظریہ محض ذہن و فکر کا مغالطہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک کورا کاغذ ہے اور وہ خالصہ اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ انسان کو اللہ نے بہترین ساخت اور بہترین فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اُس کے اندر خیر و شر اور نفع و ضرر کے درمیان تمیز کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ انبیائے کرام اس لیے تشریف لائے کہ سلیم الطبع لوگوں کو ہدایت کی راہ دکھائیں اور مبادئی فطرت کے تمام لوازم اور اس کے سارے تقاضوں کی تفہیم کریں، پھر قرآن نے دین اسلام کو ایک سیدھے دین کے طور پر پیش کیا جس کو انسان کی عقل اور اس کی فطرت کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ تقرب الہی کے حصول کا یہ سیدھا اور سادہ راستہ ہے، اس میں کہیں کوئی ٹیڑھ اور کجی نہیں ہے۔ ۴۰

فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (آل عمران: ۹۵)
(ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو حنیف تھا)

وہ رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بھی پیش کرتے ہیں :

بُعِثْتُ بِالْمِلَّةِ السَّمْحَةِ الْحَنِيفَةِ مجھے ایک ایسی ملت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے جو کشادہ ظرف، یکسو اور روشن ہے البیضاء ۴۱

اس حدیث کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں 'السّمْحَةُ' سے مراد یہ ہے کہ اس مذہب میں مشقت انگیز عبادت و اطاعت نہیں ہے، جیسا کہ راہبوں نے ایجاد کر لیا تھا، بلکہ اس دین میں ہر عذر کے لیے رخصت موجود ہے۔ یہ دین طاقت ور اور کم زور، مصروف اور فارغ ہر ایک کے مناسب حال ہے۔ الحنیفیۃ سے حضرت ابراہیم کی ملت مراد ہے البیضاء کا مطلب ہے کہ اس کے احکام، علتیں اور مقاصد سب واضح ہیں۔ غور و فکر کرنے والا ان کا ادراک کر سکتا ہے، بشرطے کہ وہ عقل سلیم کا مالک ہو اور ہٹ دھرم نہ ہو۔ ۴۲

شاہ صاحب نے نظام ارتقا کو فطرت کے مطابق ثابت کر کے تمام اقوام و قبائل اور ادیان و مذاہب کے علم برداروں کو دعوتِ فکر و عمل دی اور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اس قرآنی منہاجیات کو نافذ کرنے کا راستہ بھی دکھا دیا۔

آج جب کہ عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت، تشدد اور الزام تراشی کا ماحول ہے، اغیار کی ریشہ دوانیاں اور اپنوں کی جفاکیشیاں عروج پر ہیں اور بعض اسلام پسند افراد اور طبقات کی سادگی، سادہ لوحی اور بے بصیرتی رہنوں اور ظالموں کے لیے وجہ جواز بھی فراہم کر رہی ہے تو کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم ذرا ٹھہر کر اپنی دعوتی جدو جہد کا بے لاگ محاسبہ کریں اور قرآنی منہاجیات کی روشنی میں اجتہاد سے کام لے کرنی راہیں نکالیں۔ خاص طور سے ہندوستان جیسے ملک میں جہاں چند فرقہ پرست عناصر اور ادارے اپنے سیاسی مفاد کے حصول کے لیے ہندوؤں کی بھاری اکثریت کو، جو امن پسند

اور روادار رہی ہے، مشتعل کر کے مذہب کے گورکھ دھندوں میں پھنسا کر اقلیت کے مقابلہ میں کھڑا کر دیتے ہیں اور نفرت و تصادم کے زہریلے بیج بو کر اپنے مفادات کی کاشت کرتے ہیں، کیا حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریہ ارتقا قات نئے رنگ روپ میں، مناسب حال اصطلاحات اور اسلوب میں از سر نو نافذ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام اور ہندومت کی مشترک تعلیمات کو بنیاد بنا کر دو تہذیبوں کے درمیان ایک تاریخی مکالمہ کا آغاز کیا جائے اور اسلام کے بنیادی عقائد پر ثابت قدم رہتے ہوئے مشترک اقدار و روایات کے جلو میں مذہب کی تعمیر و ترقی کی منصوبہ بندی کی جائے؟ کیا ہمارے علماء اور دانش ور ماضی قریب کی نفسیات سے مل کر مکالمہ بین المذاہب کی نئی روایت ڈالنا پسند کریں گے؟

اس دعوتی سفر میں قرآن کریم اور سنت رسول کو رہنما بنانا ہوگا۔ دین فطرت کو عام فہم انداز میں ہندوستانی مزاج و نفسیات کو سامنے رکھ کر پیش کرنا ہوگا۔ کشادہ ظرفی، رواداری اور تحمل کو قومی کردار بنانا ہوگا اور بحیثیت مجموعی حدیث نبوی کے الفاظ میں ”الملة السمحة الحنیفیة البیضاء“ میں اپنے آپ کو ڈھالنا ہوگا۔ اکیسویں صدی کی شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے انتظار میں ہے اور ہندوستان کی مٹی ہمیشہ بڑی زرخیز اور مردم خیز رہی ہے، اس لیے اس کشت ویراں سے ناامیدی کا کوئی سوال نہیں اٹھتا۔ فہل من معیب!؟

تعلیقات و حواشی:

۱۔ انسان کی اجتماعیت پسندی و مدنیت پر فارابی بہت واضح انداز میں کہتے ہیں:

وکل واحد من الإنسان مفعولاً علیٰ انہ محتاج فی قوامہ و فی أن یبلغ افضل کمالاتہ الیٰ اشیاء کثیرة لا یمکنہ أن یقوم بها کلھا هو واحدہ، بل یرتاج الیٰ قوم یقوم لہ کل واحد منهم بشئ مما یرتاج الیہ، وکل واحد من کل واحد بهذا الحال فلذلک لا یمکن أن یکون الإنسان ینال الکمال الذی لأجلہ جعلت

لہ الفطرة الطبيعية إلا باجتماعات.

ابونصر محمد بن الفارابی، آراء اہل المدينة الفاضلة، ای جے برل، لائیڈن، ۱۸۹۵ء، ص ۵۳

۲- ابن منظور، لسان العرب، دار صادر، بیروت، مادہ رفق، جلد ۱۰، ص ۱۱۸

۳- ندوی، سید ابوالحسن علی، تاریخ دعوت و عزیمت، جلد ۵، ص ۲۲۵

۴- دہلوی، شاہ ولی اللہ، البدور البازغہ، تحقیق: صفیر حسن المعصومی، حیدرآباد (پاکستان)،

اکادمیہ الشاہ ولی اللہ دہلوی، ۱۹۷۰ء، ص ۸۴

۵- نفس مصدر، ص ۶۲

۶- دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، مصر، إدارة الطباعة المنيرية، ج ۱، ص ۴۰

۷- نفس مصدر، ۴۰/۱

۸- سندھی، عبید اللہ (مولانا)، محمودیہ، لاہور، مکی دارالکتب، ۱۹۹۷ء، ص ۱۱۶

۹- البدور البازغہ، حوالہ بالا، ص ۶۹-۷۰-۱۰- حجۃ اللہ البالغہ، حوالہ بالا، ج ۱، ص ۶۳، ۱۴

۱۱- شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں: وهذه الجماعات بذلك الربط هي المدينة في

الحقيقة. وليست المدينة في الحقيقة أسماء للسور والسوق والحصن، حتى

لو كان قري متقاربة فيها جماعات يعامل بعضها بعضاً سميناها مدينة ايضاً،

والمدينة صارت بذلك الربط شيئاً واحداً، كل جماعة وبيت منه يضاہي

عضواً من أعضاء الواحد. البدور البازغہ، حوالہ بالا، ص ۹۱

۱۲- حجۃ اللہ البالغہ، حوالہ بالا، ۴۴/۱

۱۳- نفس مصدر، ص ۹۱- شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں: ولها وحدة البتة فلا بد من

حفظ هذه الوحدة على صحتها ثم تکمیل منافعها. التدبیر الذی بہ توجد الصحة

وتکمل هو الإمام في الحقيقة، وليس الإمام عندنا هو الشخص الواحد الإنساني.

۱۴- نفس مصدر، ص ۹۳

۱۵- نفس مصدر، ص ۹۳

۱۶- البدور البازغہ، حوالہ بالا، ص ۱۱۳-۱۱۴

۱۷- حجۃ اللہ البالغہ، حوالہ بالا، ۴۱/۱

۱۸- البدور البازغہ، حوالہ بالا، ص ۱۲۵

۱۹- دہلوی، شاہ ولی اللہ، تاویل الا حادیث، تحقیق غلام مصطفی القاسمی، حیدرآباد (پاکستان)،

اکادمیہ الشاہ ولی اللہ دہلوی، ۱۹۸۸ء، ص ۷۹

- ۲۰- حجۃ اللہ البالغہ، ۸/۱ - نفس مصدر، ۹/۱
- ۲۲- دہلوی، شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، لاہور، المکتبۃ السلفیہ، ۱۹۵۱ء، ص ۱
- ۲۳- نفس مصدر ۲۳- نعمانی، شبلی، علم الکلام، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۷۹ء، ص ۹۲
- ۲۵- حجۃ اللہ البالغہ، ۸۰/۱ - نفس مصدر، ۸۹/۱
- ۲۷- البدور البازغہ، حوالہ بالا، ص ۲۶۵-۲۶۶ - نفس مصدر ۲۸- نفس مصدر
- ۲۹- دہلوی، شاہ ولی اللہ، إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء، لاہور، سمیل اکیڈمی، ۱۹۷۶ء، ۲/۱
- ۳۰- حجۃ اللہ البالغہ، ۱۲۳/۱ - البدور البازغہ، ص ۲۳۰ - نفس مصدر، ص ۲۳۲
- ۳۳- دہلوی، شاہ ولی اللہ، جمعات، تصحیح نور الحق علوی، حیدرآباد (پاکستان)، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، ۱۹۶۲ء، ص ۸۹
- ۳۴- نفس مصدر، ص ۹۰ - نفس مصدر، ص ۹۲
- ۳۶- حجۃ اللہ البالغہ، ۵۳/۱ - نفس مصدر ۳۷- نفس مصدر
- ۳۸- البدور البازغہ، ص ۷۰
- ۳۹- حجۃ اللہ البالغہ، ۱۰۴/۱- مصنف کے الفاظ یہ ہیں: الأنبياء عليهم السلام أمروا بتعديل الارتفاقات وأن لا يبلغ بها حال المتعمقين في الرفاهية كملوك العجم وأن لا ينزل بها الى حال سكان شواحق الجبال اللاحقين بالوحش.
- ۴۰- تفصیل کے لیے دیکھیے، اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، جلد پنجم، ص ۹۱-۹۳
- ۴۱- حجۃ اللہ البالغہ، ۱۲۷/۱
- ۴۲- نفس مصدر، ۱۲۸/۱- امام بخاری نے اسی مفہوم کی ایک حدیث بیان کی ہے: أحب الدين السلي الله الحيفية السمحة، صحيح بخاری، کتاب الايمان، ۲۳/۱- ابن حجر عسقلانی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ”دین کی تمام خصلتیں پسندیدہ ہیں، لیکن اس کی جو باتیں آسان ہیں وہ اللہ کو زیادہ محبوب ہیں۔ یہاں دین کا لفظ بطور جنس کے استعمال ہوا ہے، یعنی تمام ادیان میں سب سے زیادہ پسندیدہ دین۔ ادیان کا مطلب تحریف و تنح سے پہلے کی ماضی کی شریعتیں ہیں اور حقیقت سے مراد ملت ابراہیمی ہے۔ علی متقی برہان پوری، کنز العمال، ۱/۱۷۸

